# Comments

## Author's Version

A huge amount of literature in various languages, European, Asian and Indian, has been translated in Urdu during the course of past decades and centuries, but the masterpieces in Urdu have not been translated in other languages to that extent, nowhere in comparison to that. That realization was pricking my mind for some time. Individual efforts have been made by scholars here and there to translate Urdu works in other languages, but to my knowledge no concerted or institutionalized and organized effort has been made so far in that direction.

This prompted me to think about doing something whatever was possible within my limited capacity and capability. Obvious next step was to pick my small and simple poems and translate them in English. In due course it became what the Persian poet has said: "Dameed dana-o-baleed-o- ashian gah gasht".

"The grain grew and continued to grow and became a nesting place."

Thus the accumulated translations took a book form. But there lies much beyond this book which must be done. Our Urdu academies, Urdu departments in universities and other organizations have been doing good jobs in teaching and propagating Urdu but not much have been done in the area I have visualized. We, all concerned should start some organized and institutionalized effort in the required direction without losing any more time. I hope and wish that The Milli Gazette would prove and provide a forum for such efforts and ideas would get wings at this nesting place.

As for the book "My Reflections" it is a collection of a little over fifty selected poems and ghazals reflecting personal ethos of the poet and his views on various manifestations in personal and social life. The translation in English makes it possible to share all that with a cross section of people speaking languages other than Urdu and at the same time to encourage all to dig into the treasures Urdu language has been hoarding and hiding for ages. This book is a sort of exhortation to others to break the inertia and come out with whatever

presentable they possess. This will be a service to the language and the colourful culture it represents.

## Faruqi

"I like the idea of Urdu poems appearing with their English translations which have been made by the author himself. The Urdu poems are quite good, if somewhat simple but the English translations are generally excellent, certainly better than anything I have seen recently."

"I suggest that Mr. Rizwan Ullah append his surname 'Farooqi' because then we'll all be connected with him immediately as one of our own widespread clan."

Shamsur Rahman Faruqi

*Posted at 11.30 AM on July 29, 2011*

## Zahir Anwar

I have gone through the original and translated version of the poetic compositions of Mr. Rizwanullah sahib.

At the outset I must confess that I am neither a poet nor a critic of stature and thus I am not in a position to pass a judgment on the comparative merits of the original poems and translations. I can only give my humble opinion as a reader and say with some confidence that the creative energy in the original Urdu verses and the genuine effort of the poet himself to convey the meaning and essence of the original in English language are commendable and touched me.

The poems and ghazals are simple, true to the spirit of the subject matter and at times exquisite in effect. Durga Puja and Calcutta are fine poems and portrayed with certain warmth of feelings. The ghazal in tune with the musical strain of the inimitable Amir Khusru is more than satisfactory in the original.

Translating poetry, even by poets themselves, is a tough job. It calls for an expertise and command of the languages involved. Both authenticity and artistic integrity are of paramount importance. There is always a very thin line between a

near-perfect translation of a poem and a poor one. The perfect transmission of emotion and genuine linguistic authenticity should be the criterion of genuine literary translations.

The poet has succeeded considerably in translating the spirit and meaning of his own verses. The emotions, too, are conveyed admirably to the readers. Although at times one tends to feel that these are mostly exact translations of the Urdu poetry and hence straight forward, there is inherent cadence in the diction. Simple language is used instead of high-flown expressions. Perfect words seem to have been found in perfect order. However there is always room for improvement and it is always nice to go back to the drafts again for some replacements here and there and make it more musical than prosaic translations. It remains the priority of the poet himself to find out where little bit of changes can make a world of differences.

Zahir Anwar, Calcutta

(This is only my humble opinion and may not be taken seriously.z.a)

## ظہیرانور

جناب رضوان اللہ صاحب کی شاعری کے مختصر نمونے میرے سامنے ہیں، ان کے مطالعہ سے مجھے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا ہے کہ یہاں گہرے احساس اور جذبے کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ذاتی شعور کی شمولیت کا بھی احساس ہوا ہے۔ان کے شعری تجربے، مناظر کی عکاسی اور منفرد آواز کی لہروں میں خالص شاعری کا ایک در کھلا ملتا ہے جو قدیم وجدید اور مخصوص تحریک کی شاعری سے مختلف اور تازہ کاری کے وصف سے بھرپور ہے۔

ان کی نظمیں درگا پوجا، کلکتہ اور تقسیم اور اس کے بعد ایسی نظمیں ہیں جو منظر نگاری اور مخصوص شہر و حالات کی زائیدہ ہیں، اگرچہ وقت بدل گیا ہے، زمانے نے قیامت کی چال چلی ہے، شہر اور پوجا کا تصور اور اس کی صورتِ حال اور مناظر میں حد درجہ تبدیلی نے جنم لیا ہے، تاہم رضوان اللہ صاحب کی نظمیں ہمیں اپنی منظر نگاری، جذبے کی فراوانی اور آفاقی پہلوؤں سے متاثر کرتی ہیں۔آج کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں کلکتہ اور درگا پوجا جذبے اور مناظر کی سچائی اور تصور کے acuteness کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے اشعار دیکھئے:

کوندا سا ہر طرف کو لپکتا ہے، دیکھئے
یا رب ہو خیر خرمنِ دل کی، بچایئے

(درگا پوجا)

ان کی یہ بت گری بھی عدیم المثال ہے
آذر ہیں اپنے وقت کے فن میں کمال ہے

(درگا پوجا)

یا پھر

اے کلکتہ! اے مخزن عرفان و آگہی
بانگ سروش ہے تری پل بھر کی خامشی
فکر رسا ہے تیری زمانے سے تیز تر
پہنائے ممکنات سے سے آگے تیری نظر

یوں لگتا ہے کہ شاعر کا مشاہدہ نہ صرف سچائی پر مبنی ہے بلکہ اپنی شاعری کی روایت اور زبان کی نزاکت سے بھی شاعر کو گہری آگاہی ہے۔ یہ اشعار اپنی تمام تر سادگی میں ہمیں مسرت فراہم کرتے ہیں اور اپنے مشاہدے اور تجربے میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہاں شاعر کا جمالیاتی پہلو اور موضوعات سے گہرا شغف قاری کو شاعر کے تصور اور دل کی دھڑکن میں شامل کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظمیں ''تقسیم کے بعد'' اور ''بازیافت'' کو پڑھتے ہوئے موضوعات یا زبان کی پیچیدگیوں کو decode کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور الفاظ کے زیر و بم ہمارے دل کو چھو لیتے ہیں۔ تقسیمِ وطن پر ان کی نظم نہ صرف پُر اثر ہے بلکہ ان کے تخلیقی اظہار کو نہایت دردمندی سے ہم آہنگ کر کے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ تقسیمِ وطن کے تاریخی تناظر میں زندگی کے مناظر الگ اور وسیع تناظر میں بدلے ہیں، اس بڑے حادثے نے زندگی کو نہ صرف تہہ و بالا کیا بلکہ بقول شاعر ''سرو سمن کے سر سے قیامت گزر گئی'' کے سنگین کرب سے ہمارے شعور کو مہمیز کرتا ہے۔ جو دکھ اس حادثے نے دیا اس کا نہایت ہی پُر اثر احساس ان کی اس نظم میں اجاگر ہوتا ہے۔ اگر چہ اس تاریخی تناظر میں زندگی کی پرانی اور اعلیٰ قدروں کی پائمالی بھی اہم قدر ہے، تاہم جس درد کو شاعر نے اپنی نظم میں سمیٹا ہے وہ ہمارے لیے اور ہمارے اجتماعی شعور کے لیے بڑا ہی رقّت انگیز تصور پیش کرتا ہے۔ اگر چہ مختلف شہروں اور گاؤں گاؤں میں اس تقسیم نے جو فساد برپا کیا اور جس طرح کی بے کلی کا احساس پایا گیا ہوگا، وہ بھی ایک اہم پہلو ہے۔ لیکن ان کی نظم نے جو تاثر قائم کیا ہے وہ گہرا اور دیرپا ہے اور انسانی وجود پر لگی ضرب کو بڑی تاثیر کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے:

صبح ظفر کی بات تھی، شام الم ملی
وہ کربلا سے کم تھی نہ کوفے سے کم ملی

ذاتی اور سیاسی پس منظر کا یہ بلیغ بیان شعری حوالے سے کم اہم بات نہیں۔ اسی طرح ان کی نظم ''بازیافت'' میں زبان

اور مشاہدے کا حسن اور نظم کا باطنی آہنگ ایک تخلیقی فنکار کا آہنگ اور احساس شعر و نغمہ کی صورت اختیار کر کے ہمیں بھی اپنے جلو میں لیے سفر کرتے ہیں۔ ان کی ایک غزل جو حضرت امیر خسرو کے لہجے اور ذہنی فضا میں تخلیق ہوئی ہے، کم متاثر کن نہیں ہے۔ زبان پر قدرت اور اردو فارسی شاعری کے تاریخی تناظر پر پوری گرفت کے بعد ہی ایسی غزل تخلیق ہوتی ہے۔ اس غزل کے ہر شعر میں ایک کیفیت اور مخصوص فضا کی شمولیت نے غزل کو حسن اور وقار عطا کیا ہے۔ خاص طور پر یہ دو اشعار دیکھئے:

شبِ تار جو کہ تھی ہمسفر کسی راستے میں بسر ہوئی
ہو بیانِ وحشتِ دل بھی کیا، جو گزر گئی سو گزر گئی
وہ دعا تھی میرے شکستہ دل کی جو سدرہ پر بھی نہ رک سکی
رہِ عرش اس کی نظر میں تھی، نہ ادھر گئی نہ اُدھر گئی

ان نظموں کے انگریزی ترجمے بھی خوب ہیں، اگرچہ شاعر کا کیا ہوا ترجمہ اکثر بہترین ترجمے کی صف میں نہیں بھی آسکتا ہے، لیکن یہ ترجمے نظموں اور غزل کی روح تک پہنچنے کی بہترین کوششیں ہیں، کہیں کہیں لفظوں کے براہِ راست ترجمے کی بنا پر ایک گوشہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ (یہ میری ذاتی اور flawed رائے بھی ہوسکتی ہے)

ظہیر انور، کلکتہ

# مصنف کا اپنا ترجمہ

## ف۔س۔اعجاز، کلکتہ

رضوان اللہ صاحب کہنہ مشق صحافی ہیں۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے کلکتہ ان کا مستقر تھا۔ رٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنے علمی شوق کے تنوع اور وسعت کی خبر اس طرح دی کہ وفور کے ساتھ اپنی شاعری نظموں اور غزلوں کی شکل میں مختلف رسائل اور پھر مجموعوں کے روپ میں شائع کروائی۔ کلکتہ سے وابستہ اپنی صحافتی زندگی کی یادوں پر مشتمل ایک وقیع کتاب بھی شائع کی۔

کلکتہ سے متعلق مقامی شعرا نے وقتاً فوقتاً نظمیں اور غزلیں کہی ہیں جن میں سید حرمت الاکرام مرحوم کا نام ان کی طویل نظم ''کلکتہ ایک رباب'' کی وجہ سے معروف ہوا۔ حال میں رضوا اللہ صاحب کی بھی کلکتہ سے متعلق چند نظمیں نظر سے گزریں۔ ان نظموں میں ''کلکتہ کو سلام''، ''درگا پوجا'' کے علاوہ کلکتہ میں کہی گئی ''تقسیم اور اس کے بعد'' عنوان کی نظم بھی قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو کلکتہ کے تمدن سے وابستہ رضوان اللہ صاحب کا شعور انھیں شاعری میں کسی قسم کے تخلیقی جتن سے کبھی فارغ نہیں ہونے دیتا۔ ان کی ایک سے زائد فنی جہات میں اب ایک اور جہت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اپنی ہی اردو شاعری کے انگریزی مترجم

کے حیثیت کا۔ یہ گویا اپنے ہی اندر دریائے فن پر ایک پل تعمیر کر کے دو کناروں کو ملانے کی سعی ہے۔

اچھی کوششیں فن کے پارکھ کو خود متوجہ کر لیتی ہیں۔ اپنی اردو شاعری کے لسانی متبادل کے طور پر رضوان اللہ صاحب نے انگریزی متن ملاحظہ کے لیے روانہ کیا ہے۔ ترجمہ کے فن پر عجلت میں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ لفظی متبادل کامیابی سے برتنے کا انحصار کئی باتوں پر ہوتا ہے، بعض لوگوں کی رائے میں ٹیگور نے اپنی ہی کئی بنگالی نظموں کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا اس سے بہتر ترجمہ دیگر مترجمین نے پیش کیا۔ جب تک رضوان اللہ صاحب کی شاعری کا کسی اور کا ترجمہ سامنے نہیں آتا، ان کے اپنے ترجمے کو خوش آمدید کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ یہ مصنف کا اپنا ترجمہ ہے۔ اس نے اپنی آزادی سے کیا ہے۔

# ''عکسِ خیال'' یا درونِ ذات کے کرب کا اظہاریہ

## سہیل انجم

ہماری صحافتی برادری کے بزرگ دانشور جناب رضوان اللہ صاحب سے تعلقِ خاطر کے ایک طویل عرصے پر جب میں اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوں تو چونک چونک جاتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دینا ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ وہ ہر دو چار مہینے پر یا سال چھ مہینے پر اپنی کسی نئی فکری کاوش سے حیران ضرور کر دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت بظاہر بہت سادہ مگر بہ باطن بہت تہہ دار ہے۔ کبھی ان کے پس پشت سے ایک صحافی جھانکنے لگتا ہے تو کبھی ایک ادیب، کبھی ایک شاعر تو کبھی ایک مزاح نگار اور کبھی ایک مترجم۔ لیکن ان تمام شخصیتوں میں جو چیز قدرِ مشترک ہے وہ ہے اندرونِ ذات کا کرب، جو باہر نکل آنے کے لیے ہمیشہ بے تاب اور بے چین رہتا ہے۔ جب بھی کبھی اسے اظہار کا وسیلہ ملتا ہے تو وہ خود کو اہلِ ذوق و اہلِ دل کے آگے بالکل بے نقاب و بے حجاب کر دیتا ہے۔ لیکن اس بے نقابی و بے حجابی کی کیفیت میں بھی ایک پردہ داری رہتی ہے جو ان کی شخصیت کو تہذیب و شائستگی اور وقار و احترام عطا کرتی ہے۔ آپ کی نظموں اور غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ ''عکسِ خیال'' (معہ انگریزی ترجمہ) میرے اس خیال کی تائید و توثیق کے لیے کافی ہے۔

یوں تو اس کے تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں آزاد نظمیں، دوسرے میں غزلیں اور تیسرے میں پابند نظمیں ہیں۔ لیکن اگر آپ ایک حساس دل اور بیدار ذہن کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں تو اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچیں گے کہ یہ تینوں ابواب اندرونِ ذات کے کرب کے اظہار اور تہذیبی و سماجی کشمکش پر مرثیہ خوانی سے عبارت ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو شائد غلط نہیں ہوگا کہ آخری دونوں ابواب پہلے باب کے تکملہ ہیں۔ اور اگر بہ زبان شاعری وضاحت کی جائے تو پہلے باب کی پہلی نظم مصرعہ اولیٰ ہے تو آخری نظم مصرعہ ثانی۔ درمیان کی جتنی بھی نظمیں ہیں وہ الگ الگ شعری وجود ہیں جو اپنے آپ میں مکمل اور بھرپور ہیں۔

زندگی ایک ایسی ٹھوس، اٹل مگر فانی حقیقت ہے کہ وہ ہر ذی روح کو کچھ بھی کرنے کا بس ایک ہی موقع دیتی ہے۔ یہ

آپ کے شعور و آگہی کے اوپر ہے کہ آپ اس موقع کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب نے اس حقیقت کو شعری اشاروں اور کنایوں میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ عمر کے کسی نہ کسی پڑاؤ پر اس بنیادی حقیقت کا ادراک ہر کس و ناکس کو ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کو آپ کس انداز میں لیتے اور ان لمحات کو کس انداز میں جیتے ہیں۔ نظم ''اکیلی کتاب'' دراصل زندگی کی حقیقتوں کے اظہار کے پیرایے میں اندرونِ ذات کا کرب لوگوں سے شیئر کرتی ہے۔ شاعر اپنی زندگی کے مختلف مراحل پر نظر ڈالتا ہے تو یہ خواہش کروٹ لینے لگتی ہے کہ ''کاش ایسا پھر ہوتا'' لیکن ایسا دوبارہ نہیں ہوتا اور زندگی کسی کو دوسرا موقع نہیں دیتی۔ اس کے باوجود جناب رضوان اللہ صاحب تنہائی میں پرانی یادیں کریدتے ہیں اور جب پلکیں نمناک ہو جاتی ہیں تو نیند کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسے میں نیندان سے بھی برق رفتاری سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور اپنی آغوش وا کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اذیت و کرب کی زیادتی دیکھ کر وہ بھی روٹھ جاتی ہے اور ایک نئے غم والم کے سمندر میں غوطے لگانے کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔

نظم ''پت جھڑ'' بھی اندرونی کرب کا مرثیہ ہے۔ اس مختصر سی نظم میں زندگی کی مسرتوں اور شادمانیوں، خوش کامیوں اور خوش خرامیوں کو حسرتوں، مایوسیوں، ناکامیوں و نامرادیوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنا شاعر کی مجبوری ہے اور اس مجبوری نے دل کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

اس پیڑ پر پھل پھول تھے
بچوں کے پتھر آتے تھے
پھولوں کی جیسے پھلجھڑی
کیا سایہ تھا دیوار تھا
کتنے تھکے ہارے ہوئے
مہجور و محزوں کتنے ہی
دم لے کے بڑھتے تھے یہیں

لیکن جب گلستانِ حیات میں خزاں کا دور دورہ ہوا تو سب کچھ ختم ہو گیا:

بچے نہیں بوڑھے نہیں
نوخیزیاں کترا گئیں
راہی تھکے ہارے نہیں
گویا نشان رہ نہیں
بس کچھ دنوں کی بات ہے

یہ ''بس کچھ دنوں کی بات ہے'' حسرتوں کا ایک ایسا بحرِ متلاطم ہے جو شاعر کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور اس بحرِ متلاطم سے کسی کو مفر نہیں۔ اور اس نظم کا آخری مصرعہ تو ایسا ہے کہ اس سے بڑی کوئی صداقت نہیں، کوئی سچائی نہیں۔ لیکن اس مصرعہ آخر کو اس کے پہلے مصرعہ کے ساتھ پڑھیں تو ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ''بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر آئیں گے تیشے لیے۔'' گلشنِ حیات کا وہ درخت جو شجرِ سایہ دار تھا جب خزاں کا شکار ہو گیا اور سایہ و ثمر کی امیدیں ختم ہو گئیں تو اس کا مصرف صرف یہی ہے کہ اسے قطع و برید کے انجام سے ہمکنار کر دیا جائے۔ زندگی تو یہی ہے کہ جب اس کا کوئی مصرف نہیں رہ جاتا تو پھر اس کی بقا کا کیا جواز۔ تیشے ہوں یا پھاوڑے، کام دونوں کا ایک ہی ہے۔

کرب و اذیت اور حزن و ملال کا کوئی کنارہ نہیں، کوئی ساحل نہیں۔ ''جراحتوں کی سوغات'' ہو یا ''پرانے درد کا بیدار ہو جانا'' سب ایک ہی کیفیت کے الگ الگ مظہر ہیں۔ جراحتوں کی سوغات کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اور پرانے دردوں کا کوئی گاہک نہیں ہوتا۔ ان سوغاتوں کو خود ہی اپنا پشتارہ بنانا پڑتا ہے اور درد کی گٹھری کو اپنے ہی دوش پر ڈھونا پڑتا ہے۔ ایسے میں درد کی لذتوں کو دوام حاصل ہو جاتا ہے اور ان لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا فن اگر آتا ہے تو ''راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا'' کا مزا آ جاتا ہے۔

ایک نظم ہے ''آہنگ نشاط''۔ جب کوئی خوشگوار حادثہ گزرے ہوئے رنگین لمحوں کو بیدار کر دیتا ہے یا پرانی پر لطف یادوں کے چراغ روشن کر دیتا ہے تب کہیں جا کر ایسی نظم تخلیق ہوتی ہے۔ اس نظم میں جو کیفیتِ مسلسل ہے وہ بہت سے سوالات کے در وا کرتی ہے اور آخر میں اس نتیجے پر جا کر ختم ہو جاتی ہے کہ یہ وہ سوال ہیں، جن کے جواب کسی کے پاس نہیں۔ اب نہ تو شراروں میں کوئی حرارت ہے اور نہ ہی نگارخانوں میں کوئی حسین پیکر:

صبا کی گل پر لطیف دستک
پھوار شبنم کی پنکھڑیوں پر
سکوں فروشی خرامِ خوش کی
کہ خوابِ تازہ کی دید پیہم
کہ سعیِ پُر کیف و وجد آگیں
کہ دستِ گلگوں کی دل پہ دستک
یہ کیا ہے پروردگار میرے
کسے شراروں کی جستجو ہے
کتابِ ہستی پلٹ رہا ہے
ورق ورق کو الٹ رہا ہے

وہ جو کوئی بھی ہے یہ سب کیوں کر رہا ہے، کیا اس میں کوئی لذت کوشی ہے، کیا ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کیونکہ:

کتابِ ہستی کے باب سوئے
نگارخانوں کے خواب سوئے
جوانیوں کے عذاب سوئے
سوال جاگے جواب سوئے

یہ نظم دراصل کیف وسرمستی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے یا یوں کہیں کہ ان سرمستیوں کے پیرایے میں رنج ونشاط کی کشمکش کو واضح کرتے ہوئے قاری کو درد کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے اور سچ بات یہ ہے کہ یہ بھی درونِ ذات کے کرب کی ایک شکل ہے، ایک مظہر ہے۔

ایک نظم ہے ''تلاش''۔ اس میں شاعر نے قدروں کے زوال پر ماتم کیا ہے۔ آج ملک میں انسانی احترام کی ردا جس طرح چاک چاک ہوئی ہے اس نے ہر ذی شعور کو فکرمند کر دیا ہے۔ آج اگر آپ آدمی کو تلاش کرنے نکلیں تو ناکامی ہاتھ لگے گی۔ انسانوں کے سمندر میں انسان تو ملیں گے، یہاں تک کہ فرشتے بھی ملیں گے لیکن وہ آدمی نہیں ملے گا جو ایک دوسرے آدمی کا ہمدرد بن جائے، اس کا شریکِ غم بن جائے۔ آدمی کہاں ملے گا؟ محفلوں میں، مجلسوں میں، معبدوں میں؟ نہیں کہیں نہیں۔ پھر..... مجھے آدمی کی تلاش ہے۔

ایسے آدمی کی جو آدمی ہو
ایسا آدمی جس میں آدمیت ہو
مجھے آدمی کی تلاش ہے
اور وہ تو میں ہی ہوں

اس آخری مصرعہ میں جو حیرانی ہے وہ ذات کی تلاش کی طرف ہمارے شعور کی لگام کو موڑ دیتی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے مشینوں کی حکومت کو روح کی موت قرار دیا تھا۔ نظم ''احوال'' بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے لیکن بہ اندازِ دگر۔ اس کے بین السطور میں یہی مفہوم پوشیدہ ہے کہ جب روح کو غلامی کی عادت پڑ جاتی ہے تو اقوام انقلابات سے ناآشنا ہو جاتی ہیں اور اجتماعیت کی جگہ انتشار کی شکار بن جاتی ہیں۔

آج کی دنیا جو خود کو ترقی یافتہ یا ترقی پذیر کہہ رہی ہے دراصل بے سمتی کا شکار ہے۔ لوگ ہوا کے دوش پر سوار بس بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ جس کارواں میں شامل ہیں اس کی بھی کوئی سمت نہیں، اس کی کوئی دِشا نہیں۔ جب ایک حساس دل اس کیفیت کو محض دیکھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ''برسرِ راہ گزر'' جیسی نظمیں جنم لیتی ہیں۔

آج کی دنیا انٹرنیٹ کی دنیا ہے جو ہر شعبہ حیات میں مکمل طور پر ڈیجیٹلائز ہو جانا چاہتی ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں کہ

اعداد کا یہ کھیل اسے تباہی و بربادی کے سمندر کی طرف لے جا رہا ہے اور ایک روز یہ اعداد اسے اس طرح فنا کر دیں گے کہ پھر وہ گنتی ہی بھول جائے گی۔ ''نئے آدم کی تلاش'' اسی جانب اشارہ کرتی ہے:

آدمی آدم بنائے گا نیا، بالکل نیا
پھر اسی آدم کی تخلیقِ مکرر سلسلہ در سلسلہ
سارے سانچے توڑ دیں گے اس نئے پیکر کے بعد
ایک رنگت، اک قد و قامت، زبان و نسل ایک
گنتیاں ہوں گی، عدد ہوں گے، بجائے نسب و نام
بے خبر ماضی سے، مستقبل سے نا آگاہ سب
حال میں جیتے رہیں گے حال میں مر جائیں گے
آدمیت، دوستی، انصاف، امن و آشتی
یعنی فرسودہ لغات
علم، تعلیم و تلمذ ایک ساتھ
سب سے گہری کھائی میں تاریخ کی
دفن کر کے اس سے فرصت پائیں گے
پھر ستاروں کا جہاں ہوگا
وہیں اڑ جائیں گے

یہ نظم محض نظم نہیں، مستقبل کی تباہی و بربادی سے آگاہ کرنے والا جرسِ کارواں ہے، ناقوسِ وقت ہے۔ کاش یہ دنیا جو اعداد کے چکر میں پھنس گئی ہے اس کی ہولناکیوں سے آگاہ ہو پاتی۔

اب اس باب کی آخری نظم پر ایک نظر جس کا عنوان ہے ''کتاب کا آخری باب'' اور جسے میں نے غزل کا مصرعہ آخر قرار دیا ہے۔ پہلی نظم نے جس کا عنوان تھا ''اکیلی کتاب'' جس کرب و اذیت اور رنج و محن کا ابتدائیہ پیش کیا تھا، اس آخری نظم نے اس کا اختتامیہ لکھ دیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ کتابِ زندگی کو دوبارہ لکھا نہیں جا سکتا اور مقامِ افسوس یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ سب محو ہو گیا ہے، بے عکس ہو گیا ہے، بے چہرہ ہو گیا ہے۔ سارے مناظر دھندلا گئے ہیں، سارے صفحات سپاٹ نظر آ رہے ہیں، الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا ہے اور قلم ترجمانی دل سے تائب ہو گیا ہے۔ کتاب کے قاری ایک ایک کر کے منظر سے غائب ہو گئے ہیں اور مزید تحریر کے لیے کچھ بچا نہیں ہے۔ واقعی کتاب کا آخری باب لکھنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ ایک خاص مرحلے ہی میں جا کر ہوتا ہے۔

میں نے شروع میں ذکر کیا تھا کہ جناب رضوان اللہ صاحب نے ذات کے کرب کو اپنے مخصوص پیرایہ بیان میں قاری

کے سامنے پیش کیا ہے اور عکس خیال کی تخلیقات، احساسات و جذبات کے اظہار کا ایک کامیاب ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس کی غزلیں بھی اسی پیرایے میں ہیں اور پابند نظمیں بھی۔ مثال کے طور پر:

حال ہمارا کیا پوچھو ہو آگ دبی اکساؤ ہو
شعلے کب کے راکھ ہوئے اب خاک انھیں لہکاؤ ہو
کیسی کوئی چاہت واہت بہکی بہکی باتیں ہیں
اپنی اپنی راہ لگو کیا سنکے کو سنکاؤ ہو

ازل سے سنی اجاڑ بستی میں کوئی مہماں ہوا نہیں ہے
کوئی بھی نغمہ سرا نہیں ہے کہیں بھی رنگ حنا نہیں ہے

آنکھوں میں جو منظر ہے وہ منظر نہیں ملتا
کیا وقت پڑا ہے کہ مرا گھر نہیں ملتا

یہ آخری مصرعہ دراصل موجودہ ہنگامہ آرائیوں میں انسانیت کے گم ہوجانے کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے۔

خالی آنکھوں میں خواب دیکھتے ہیں
تشنہ لب ہیں سراب دیکھتے ہیں
جو لکھے تھے کتاب ہستی میں
دھندھلے دھندھلے سے باب دیکھتے ہیں

اسی طرح اس مجموعہ کی پابند نظمیں بھی درد کے سمندر میں غوطہ زن کر دیتی ہیں۔ ''عکس خیال'' محض عکس خیال نہیں بلکہ برہنہ سچائیوں کی تمثال ہے اور جناب رضوان اللہ صاحب کی مملکتِ فکر وسخن کا ایک گوہر آب دار ہے۔ اس پر ان کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

sanjumdelhi@gmail.com

# عکسِ خیال

## وصیل خان

شاعری کو اگر الہامی درجہ پر فائز کیا جاتا ہے تو میری دانست میں وہ سو فیصد درست تصور ہے کیوں کہ شعر گوئی ایسا فن ہے جسے ہم صرف اور صرف خدائی عطیہ کہہ سکتے ہیں اس کا تعلق محض علم سے ہی نہیں بلکہ بصیرت سے بھی ہوتا ہے۔ بصیرت و ذہانت، فکر و تدبر وہبی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی یہ نعمت خاص اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے یہی سبب ہے کہ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دنیا کے کسی خطے سے حاصل کر لیں اور زورِ علم پر اشعار ترتیب بھی دے لیں لیکن تخلیق میں وہ وفور و تلاطم اور تخیل کی سربلندی کہاں سے لاسکیں گے جو اصلاً آپ کے دامن میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک معمولی پڑھا لکھا انسان اپنی وہبی ذہانت و فطانت کے ذریعے فن پارہ پیش کرنے میں پوری طرح اپنی قوت و قدرت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

''عکسِ خیال'' کے مصنف رضوان اللہ صاحب ہیں جنھیں قدرت نے وہبی اور کسبی دونوں ہی علوم سے نواز رکھا ہے۔ علمی سطح کے اعتبار سے انتہائی زرخیز علاقہ اعظم گڑھ سے ان کا تعلق ہے جس کے لیے اقبال سہیل نے کبھی کہا تھا ''جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرِ اعظم ہوتا ہے۔'' کلکتہ میں ایک طویل مدت تک صحافت سے منسلک رہنے کے بعد وہ دہلی میں امریکن سینٹر سے وابستہ ہو گئے اور وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ ان کی شعری تخلیق عکسِ خیال بالاستیعاب دیکھی اور بار بار دیکھی، ہر مرتبہ معانی و تصورات کا نیا نیا زاویہ ابھر کر سامنے آیا۔ اشعار میں اتنی تہہ داریاں، اتنی جہتیں ہیں اور زبان و بیان کے اتنے دریچے ہوتے ہیں کہ زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور زاویوں کے ساتھ انتہائی واضح انداز میں جلوہ فگن ہو جاتی ہے۔ ان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو بے خبری سے شعور و آگہی کی راہ دکھاتے ہیں کیوں کہ اچھی شاعری میں بے خبری کا کوئی گزر نہیں۔ ان کے اشعار جذبات کو تو برانگیختہ کرتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ قاری کو اپنے گرد و پیش کی وہ جھلک بھی دکھاتے جاتے ہیں جن میں الفت و محبت، شقاوت و درندگی، ایثار و قربانی، درد و غم، وفا شعاری اور کمینگی و عیاری کی واضح ترین صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے دور میں جب پورا معاشرہ فتنوں سے بھرا ہوا ہو حقائق کو پوری وضاحت اور صاف گوئی سے بیان کر دینا ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے تمام داخلی و بیرونی تجربات پر عمیق نظری کے ساتھ ان کی نگاہیں سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر بھی بڑے ماہرانہ انداز میں پڑتی ہیں اور جب وہ انھیں انسانیت کے سانچے میں ڈھال کر شعری پیکر میں تبدیل کرتے ہیں تو پھر یہی طرزِ بیان انھیں انفرادیت کے افق پر روشن کر دیتا ہے۔ انگریزی اور اردو کے ساتھ فارسی پر بھی ان کی گرفت بہت مستحکم ہے جس کا مشاہدہ کتاب میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

رضوان اللہ نے اپنی نظموں اور غزلوں کا خود انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے ایک صفحہ پر اردو اور فارسی کلام اور سامنے کے صفحہ پر انگریزی ترجمے دیے گئے ہیں۔ ترجمے کیسے ہیں اس تعلق سے ہم اپنی رائے نہ پیش کرتے ہوئے اردو کے مشہور و معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے پیش کیے دیتے ہیں ''اردو کا کلام سادہ مگر اچھا ہے لیکن انگریزی ترجمہ عام

طور پر شاندار ہے میں نے حال میں جو ترجمہ دیکھے ہیں ان سے کہیں زیادہ بہترین۔''

ف.س.اعجاز کا یہ تجزیاتی تاثر بھی کتنا درست ہے: ''رضوان اللہ صاحب کا شعور انھیں شاعری میں کسی قسم کے تخلیقی جتن سے کبھی فارغ نہیں ہونے دیتا۔ان کی ایک سے زائد فنّی جہات میں اب ایک اور جہت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اپنی ہی اردو شاعری کے انگریزی مترجم کی حیثیت کا۔گویا اپنے ہی اندر دریائے فن پر ایک پل تعمیر کر کے دو کناروں کو ملانے کی سعی۔''

کتاب نظم وغزل دو حصوں پر مشتمل ہے اور دونوں صنفوں میں قوتِ اظہار نہایت مستحکم وتوانا ہے۔کتاب سے کچھ اشعار بطور نمونہ درج ہیں، امید ہے کہ آپ ضرور پسند کریں گے۔

نئے اصحاب فیل ان کے شکاری
ابابیلوں کی شاید پھر ہے باری

حال ہمارا کیا پوچھو ہو آگ دبی اکساؤ ہو
شعلے کب کے راکھ ہوئے اب خاک انھیں لہکاؤ ہو

تیری انا پئے خروش میری انا گلیم پوش
فکر تری گریز پا سرتا قدم ہوں گوش و ہوش

بھولی بسری باتیں چھوڑو عہد گریزاں لائے کون
ہم بھی قاتل تم بھی قاتل اس پر اب پچھتائے کون

سحر دمید بیا بام و درکشادہ کنیم
بیا کہ قصہ فصلِ بہار تازہ کنیم

اک پتنگے کو بھی مقام فنا
گرمیٔ عشق ہی سے ملتا ہے

(اردو بک ریویو، دہلی، جنوری، فروری، مارچ ۲۰۱۴ء)